© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

اساسیاتِ اسلام

(۲)

بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر دین و دانش کے تصادم کی ذمہ داری دونوں حلقوں پر عاید ہوتی ہے جب پہلے پہل گلیلیو، نیوٹن اور کوپرنیک کے نتائج فکر و مشاہدہ کے سامنے آئے اور یہ معلوم ہوا کہ زمین سچ مچ آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے اور یہ کہ عالم علوی کے مقابلہ میں اس کی حیثیت اور ضخامت اس باریک داغ اور نقطہ سے بھی کم ہے جو کسی بڑے کرے کی سطح پر نمایاں ہو تو اس سے اہلِ الحاد نے یہ نتیجہ نکالا کہ عظمتِ آدم کا تصور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ یعنی عالم علوی کی وسعتوں کے مقابلہ میں زمین اور زمین پر بسنے والی مخلوق حقیر ٹھہری اور یہ ثابت ہوا کہ جہاں تک نظام فطرت کی پہنائیوں کا تعلق ہے یہ ناممکن ہے کہ اس درجہ کم، کہتر اور ناقابل اعتنا وجود تو حقیقی و اصلی قرار پائے اور یہ ناپیدا کنار وسعتیں محض ضمنی حیثیت کی حامل ہوں۔ اہل الحاد نے اس طرح کی معلومات سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ عالم، اس کا بے پناہ پھیلاؤ اور ضخامت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فطرت کے سامنے حقیقی غایت تو خود اس عظیم نظام کی پرورش ارتقا اور تکمیل ہے اور اس میں انسان کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ یا یوں کہیے کہ فضا اور عالم علوی میں جو کروڑوں کرے پائے جاتے ہیں ان میں ارتقا و تکمیل کا قانون کارفرما ہے اور انسان اس قانون کی کارفرمائیوں کا ایک اتفاقی نتیجہ یا ناقابلِ التفات جزُ ہے۔ لہٰذا نہ یہ خدا کا نائب ہے نہ اس کے لیے وحی و کتاب کی روشنی ضروری ہے اور نہ ان انفرادی اور اجتماعی اقدار کی حاجت ہے کہ جن کی اشاعت و ترویج کے لیے انبیاء مبعوث ہوتے۔

اہل کلیسا نے یہ غلطی کی ہے کہ بجائے اس کے کہ طبیعیات اور اقدارِ حیات میں جو فرق ہے اس کو واضح کرتے، اُلٹے انھوں نے ان اکتشافات ہی کی تردید شروع کر دی۔ حالانکہ ان کو یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نا چاہیے تھا کہ کائنات کے بارہ میں طبیعی نقطۂ نظر اور چیز ہے اور اخلاقیات شئ دیگر۔ ان کو اس قیقت کو فراخ دلی سے تسلیم کر لینا چاہیے تھا کہ زمین گھومتی ہے۔ انھیں مان لینا چاہیئے تھا کہ پورے لم کے مقابلہ میں اپنی ضخامت و وسعت کے لحاظ سے یہ بہت ہی کم تر درجہ کی حامل ہے لیکن اس کے ساتھ س بات پر زور دینا ضروری تھا کہ اس سے عظمتِ آدم کے تصور کو قطعی گزند نہیں پہنچتا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے سارے ملحدانہ افکار کی بنیاد دراصل اسی غلط مفروضہ پر مبنی ہے کہ علمی اور سائنسی انکشافات سے اخلاقی و دینی اقدارِ حیات کی تردید ہوتی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ ان دونوں کے دائرے بالکل الگ الگ ہیں۔ طبعیات اور سائنس کے انکشافات سے صرف طبیعی اور سائنسی نظریات ہی کی تائید یا تردید ہو سکتی ہے دین یا اخلاق کی نہیں، کیونکہ دین اور اخلاقیات کی جانچ پرکھ کے پیمانے قطعی دوسرے ہیں۔ مزید برآں جب تک ہست و باید میں فرق قائم رہے گا اس وقت تک ان دونوں کے دائرۂ اثر کا الگ الگ رہنا ضروری ہے، سائنس کی تمام تر تحقیقات "ہست" کے ضمن میں آتی ہیں اور اخلاق و دین کے تقاضے "باید" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان میں تناقض کے ابھرنے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔

انسانی عظمت کا معیار یہ نہیں کہ وہ ضخامت کے اعتبار سے کم تر یا عظیم تر کرنے پر قیام پذیر ہے۔ اس کا معیار اس کا ذہن ہے۔ اس کی عقل رسا ہے، اس کی فکری تگ و تاز ہے۔ اس کی تہذیبی و اخلاقی فتوحات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان وحی و تنزیل کے شرف سے بہرہ مند ہے اور اگر انسان اس لائق ہے کہ عظیم ترین تہذیبی حلقوں کی تخلیق کر سکے۔ علوم و فنون کے تیز رَو قافلوں کو آگے بڑھا سکے اور تا بہ آسمان پرواز کر سکے اور مریخ و قمر پر اپنی حوصلہ مندیوں کے علم گاڑ سکے تو وہ عظیم کیوں نہیں ہے۔ کیوں نیابتِ الٰہی کا مستحق نہیں ہے اور کیوں اس کو اخلاقی و دینی قدروں کی پابندی سے آزاد سمجھا جائے؟ اگر جسمانی ضخامت ہی سب کچھ ہے تو پھر خود ہمارے انسانی ڈھانچے کو بھیجے کی ان تلافیف سے افضل ہونا چاہیے کہ جن کا وزن چند تولوں اور ماشوں سے زیادہ نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان آسمانوں کی پہنائیوں سے کہیں بڑا ہے۔ زمین کی وسعتوں کے مقابلہ میں کہیں وسیع تر ہے اور پہاڑوں کی صلابت و بلندی سے کہیں بڑھ کر استوار اور بلند ہے۔ اس نکتۂ حکیمانہ کو قرآن کی اس آیت میں کس درجہ بلاغت کے ساتھ بلند کیا گیا ہے؛

"انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"یعنی انسانی عظمت کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس نے فکر و اطاعت کی گراں بار امانت کو اٹھا رکھا ہے۔"

عیسائیت کے لیے صحیح راستہ یہی تھا کہ علوم و فنون اور تحقیق و تفحص کے درپے آزار نہ ہوتی، اور جو نتائج بھی ان راستوں سے اس کے سامنے آتے ان پر فن کی حیثیت سے گفتگو کرتی اور اس بات پر یقین رکھتی کہ علم و معرفت اور وحی و تنزیل دونوں کا سرچشمہ ایک ہے، اس لیے کہیں اور کسی صورت میں بھی ان دونوں میں اَن بن نہیں ہو سکتی۔ لیکن عیسائیت کی بدنصیبی یہ ہے کہ شروع ہی سے اس نے علم و تحقیق کو اپنا حریف سمجھ لیا ورنہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ آگسٹائن جیسا حکیم زمین کے کروی ہونے پر اعتراض کرے۔ اور کاسمس انڈی کوپل اسٹیز ایسا جغرافیہ دان، جن کی جغرافیہ دانی کا سکہ آٹھ سو سال تک عیسائی دنیا میں رواں رہا اس سوال کو دینی سوال بنا لے اور زمین کو کروی اور گول ماننے والوں سے انداز طنز یہ سوال کرے کہ اگر زمین گول ہے تو پھر حشر کے روز وہ لوگ جو اس کے حصۂ زیریں میں رہ رہے ہیں خداوند خدا کو کیونکر دیکھ سکیں گے۔[1]

لطف یہ ہے کہ کولمبس نے جب اس اصل کو مان کر اپنی سفری مہم کا آغاز کیا کہ زمین گردی ہے تو اس نے بھی زمین کی کرویت پر مذہبی رنگ کی دلیل سے استفادہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی وسیع بخش رسانیوں کے منافی ہے کہ اس کا آفتاب جہاں تاب زمین کے تھوڑے سے حصے ہی پر چمک کر رہ جائے۔ دریا زیادہ تر سمندر کی لاتعداد لہریں ہی اس کا ہدف بنیں اور زمین کے اس قلیل تر خطے کے علاوہ کہیں زمین نہ ہو، کہیں آبادی نہ ہو۔ کولمبس کا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اس سے کہیں زیادہ انسانی آبادی کی طالب ہے۔

مدرسی حکما (Scholastics) کو کیا معلوم تھا کہ زمین کی کرویت کا مسئلہ ظن و تخمین کی بھول بھلیاں پھاند کر ایک نہ ایک دن علم و تجربہ کی گرفت میں آنے والا ہے اور مختلف زاویہ ہائے نظر سے اس مسئلہ کو جو آج عقل و دین کے حلقوں میں استخوان نزاع بنا ہوا ہے کل اس طرح ایک مسلمہ شدہ حقیقت قرار دیا جائے گا کہ اس کے بارہ میں دو رائیں باقی ہی نہ رہیں۔ اگر انھیں مسئلہ کے اس اندازِ تلون کا احساس ہوتا تو

---

[1] انٹلیکچول ڈویلپمنٹ آف یورپ جلد ۲، صد ۱۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ کبھی بھی اس کے ساتھ مذہبی و دینی اہمیت وابستہ نہ کر پاتے۔ یہی وہ اہم نقطہ ہے جس کو ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ظن و تخمین کے زمانے میں تو اس نوع کی غلطیوں کا ارتکاب ہو سکتا تھا کہ محض خیال آرائی کے بل پر کسی رائے کو حتمی اور قطعی مان لیا جائے لیکن علم و تجربہ کے دَور میں اس غلط فہمی میں مبتلا رہنا صحیح نہیں۔ کیونکہ جو بات کسی نہ کسی سائنس اور علم سے تعلق رکھتی ہے اسے واضح ہوتا اور نکھرنا ہے اور ایک متعین روپ اختیار کرنا ہے۔ اس صورت میں یہ خطرہ کیوں مول لیا جائے کہ اس کے ساتھ خواہ مخواہ دینی عقیدہ کو وابستہ کر دیا جائے۔ عیسائیت نے یہ اندازِ فکر اختیار کرکے دیکھ لیا ہے اور آج وہ مدرسیت کی ان بحثوں اور مناظروں پر جس قدر نادم اور شرمندہ ہے اس کا اندازہ کچھ انہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے اس نقطۂ نظر سے مغرب کی فکری تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔

کائنات کے بارہ میں یہ مسئلہ بھی اساسی حیثیت کا حامل نہیں ہے کہ آفرینش کا عمل کیونکر بروئے کار آیا۔ فرض کیجیے۔ حیاتیات (Biology) کی رُو سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ پوری کائنات چند شمسی دنوں میں نہیں بنی ہے بلکہ اس بزمِ ہستی اور معشوق ہزار شیوہ نے بننے اور سنورنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس صرف کیے ہیں، تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ کبریٰ نے اس کی پرورش و تخلیق سے دست کش ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس سے جو بات واضح ہوتی ہے یہی ہے نا کہ وہ "کن" اور حرفِ آفرینش جو اللہ تعالیٰ کے حکم و امر سے تعبیر ہے اگرچہ اس طرح کے دس ہزار عالم رنگ و بو آن کی آن میں پیدا کر سکتا ہے۔ تاہم حکم کے ساتھ اس کی حکمت و تدبیر کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں تدریج و ارتقاء کی سنت کار فرما ہے، یعنی یہ دنیا بجائے اس کے ایک لمحے اور ثانیے میں معرضِ ظہور میں آجائے سات تکوینی دنوں یا مرحلوں میں سطحِ وجود پر جلوہ طراز ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ ارتقاء (Evolution) نے اللہ تعالیٰ کے وجود کی نہ صرف نفی نہیں کی بلکہ قدرت کے پہلو بہ پہلو اس کی عظمت و دانائی کے پہلو کو اور اجاگر کیا ہے۔ غور فرمائیے کہ جو غایت ستودہ صفات، ارتقا کی ایک ایک کڑی کو پیدا کرتی ہے، ایک ایک مرحلے کے تقاضوں کی پرورش کرتی ہے اور زمان و عصر کے ہزاروں اور لاکھوں فاصلوں سے گذارنے کے بعد اس عالم کو نظام اور متعین رنگ عطا کرتی ہے۔ بجائے اس لائق ہے کہ اس کو بھلا دیا جائے، نظر انداز کر دیا جائے۔ یا یہ سمجھ لیا جائے کہ نظریہ ارتقا کے انکشاف سے کائنات سے متعلق دین کا قائم کردہ تصور غلط ثابت ہوتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمین کی کیا عمر ہے۔ ستارے کب اور کیونکر اس فضائے نیلگوں میں ضوفشاں ہوئے ہیں۔ زندگی نے پہلا قدم کیونکر اٹھایا ہے اور تدریج و ارتقا کی کن منزلوں کو طے کیا ہے۔ یہ سارے مسئلے ایسے ہیں کہ براہِ راست ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ براہِ راست ان کا تعلق طبقات الارض سے ہے علم النور سے ہے، ہیئت و نجوم سے ہے اور حیاتیات سے ہے۔ اس لیے ان علوم کی چھان بین اور تفحص کے نتیجے میں اگر کچھ نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں تو انھیں انہی علوم کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ ہمارے ہاں کے اہل علم شاید اس بنیادی نکتہ سے آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بقول سمتھ نظریہ ارتقا کے انکشاف سے جہاں مغرب میں اہل کلیسا اور دانشوروں میں شدید نوعیت کی جھڑپیں ہوئیں اور مخالفت و عناد کے طوفان اٹھے، وہاں مسلمانوں میں اس کا ادنیٰ ردعمل بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ہمارے نزدیک اس کی ایک اور بڑی وجہ بھی ہے جو یہ ہے کہ مسلمانوں میں یہ مسئلہ قطعی انقلابی نوعیت کا نہیں تھا۔ اس سے پہلے ابن خلدون خالص حیاتیات کی اصطلاحوں میں یہ اصول بیان کر چکے تھے کہ کائنات میں ہر ہر سافل سطح عالی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ابن مسکویہ بھی اپنی تصنیفات میں اس کی نشان دہی کر چکے تھے، اور رومی نے تو اس مصرع طرح پر اس طرح پوری غزل کہہ ڈالی تھی کہ جس کی وجہ سے ناممکن تھا کہ اسلامی شعور و ادراک اس مسئلہ کے بارہ میں ناآشنا رہے۔ اور جب ڈارون "اصل انواع" شائع کرے تو عالم اسلامی میں اچنبھے کی ایک لہر دوڑ جائے۔

عیسائیت نے مسئلۂ ارتقا کے بارہ میں تین موقف اختیار کیے۔ ان کے پہلے ردعمل نے استہزا کا روپ دھارا۔ طعن و تشنیع کی صورت اختیار کی اور تکفیر و عقوبت کی سرزنشوں کی شکل میں اس کے خلاف دینی حلقوں میں نفرت و حقارت کے جذبات کو ابھارا، اور جب یہ دیکھا کہ یہ مسئلہ طعن و تشنیع سے حل نہیں ہوتا، بلکہ مختلف تجربات و شواہد اس بات پر دلالت کناں ہیں کہ اس عالم میں ارتقا و تدریج کے تقاضوں کو تسلیم کیا جائے تو تاویل کی آڑ لی، لیکن تاویل آتنی بھونڈی اور غیر علمی تھی کہ پہلے ہی قدم پر ٹھکرا دی گئی۔ تاویل یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو بظاہر ترتیب اس ڈھب سے دیا ہے کہ اس سے نظریۂ ارتقا پر استدلال ہو سکے، حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ غرض یہ ہے کہ اس طرح بندوں کا امتحان لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کون اس سے دھوکہ کھاتا ہے۔ اور کون ایمان کے معاملہ میں ثابت قدم رہتا ہے۔ تاویل کے اس انداز سے اور کئی شبہات اٹھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھڑے ہوئے۔ کیا ایسا ہونا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ فکر و استدلال کے تقاضوں کو تو ایک خاص ڈھب سے ترتیب دے اور نتائج کو ان سے بالکل علیحدہ اور مختلف انداز سے پیش کرے۔ کیا ایمان اور استدلال کی راہیں جدا جدا ہیں؟ اور کیا آزمائش و امتحان کی یہ صورت انتہائی خطرناک نہیں؟ اور کیا اگر کوئی شخص ان دلائل کی روشنی میں سچ مچ ارتقا کو مان ہی لے کہ جس کو خود اللہ تعالےٰ نے مہیا اور نمایاں کیا ہے تو وہ کس قاعدہ اور قانون کی رو سے مجرم گردانا جا سکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ عیسائیت کا تیسرا اور آخری ردِ عمل یہ تھا کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کیونکہ اس وقت تک چرچ آفرینشِ کائنات کے بارہ میں جن خیالات و افکار کو مانتا چلا آیا ہے ان کو علم و تحقیق کے معیار پر ثابت کرنا مشکل ہے۔[۵۲]

فکر و نظر کے اس مرحلہ میں حقیقت کو جان لینا اشد ضروری ہے کہ ہم جب علوم و معارف اور دینی حقائق کے درمیان خطوط امتیاز کھینچتے ہیں تو اس سے ہرگز یہ مقصود نہیں ہوتا کہ تقسیم کا یہ اسلوب دوٹوک ہے اور ان میں کہیں بھی اتصال یا تداخل پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک طرف تو علوم و فنون میں اس طرح کی واضح تفریق قائم کرنا ممکن ہی نہیں کہ ان کی سرحدیں آپس میں کہیں مل ہی نہ پائیں۔ دوسری طرف دین اگر اس علیم و حکیم خدا کی طرف سے ہے کہ جس سے حال و مستقبل کی کوئی شئی بھی اوجھل نہیں ہے تو اس صورت میں اس کے کلام بلاغت نظام میں ایسے اشارات ایسی وضاحتیں اور علمی پیشینگوئیاں پائی جا سکتی ہیں کہ جو مستقبل کی غماز ہوں جو علمی گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دے سکیں اور جو اس بات پر دلالت کناں ہوں کہ یہ کلام کسی ایسے شخص کے علم و معرفت کا رہین منت نہیں کہ جس کی نظر محدود ہے۔ جس کا تجربہ اتھلا ہو یا جس کی نظر ماضی و حال سے گذر کر مستقبل کی وسعتوں تک نہ پہنچ سکے۔ یہ کلام ایسے علام غیوب خدا کا کلام ہے جس پر کہ کائنات کا ہر ہر راز آپ سے آپ عیاں اور خود بخود منکشف ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ریاضی کے بعض گوشے طبیعیات سے ملے ہوتے ہیں اور طبیعیات کے بعض انکشافات تہذیب و ثقافت اور اخلاق پر گہرا اثر ڈالنے والے ہیں۔ اسی طرح اس حقیقت سے کون ناواقف ہے کہ قرآن حکیم نے عقل و ادراک کے بعض ایسے نتائج کی طرف آج سے چودہ سو سال پہلے توجہ

---

۵۲ ہسٹری آف فریڈم آف تھاٹ بیوری ص ۱۴۴،۱۲۹،۲۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

التفات کے رخوں کو موڑا ہے کہ جنھیں لوگ آج کی میراث سمجھتے ہیں اور موجودہ علوم وفنون کی برکتوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ علوم و معارف امد دینی حقائق کے درمیان قطعی کوئی رابطہ نہیں ہے۔ یا ان میں کہیں بھی تصادم رونما نہیں ہو سکتا۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اصول کے لحاظ سے دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ دونوں کے مباحث مسائل اور اصولِ اثبات جُدا جدا ہیں۔ اس لیے نہ تو یہ کوشش کرنا چاہیے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے کسی کرشمہ و اصول پر دین کی بنیاد رکھی جائے یا کسی ایسی شے کے ساتھ دینی اہمیت والسنہ کی جائے جو علوم و فنون کے متعلق ہے اور نہ یہ درست ہے کہ دینی کتابوں سے جغرافیہ، طبقات الارض اور علم النور او حیاتیات کے عقیدے اور نظریے نکالے جائیں۔ غرض یہ ہے کہ لوگ دین اور علوم کے بارے میں کسی ذہنی گڑبڑ کا شکار نہ ہوں اور صاف صاف اس حقیقت کو پالیں کہ دونوں مزاج، نصب العین اور نتائج کے اعتبار سے مختلف راہوں پر گام فرسا ہیں۔ جہاں عقل وادراک کی تگ و تاز فطرت کے رازہائے دروں پردہ کو سمجھنا چاہتی ہے اس پر قابو پانا چاہتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ اس سے عجیب و غریب کام لیے جائیں۔ وہاں دین کا مقصد یہ ہے کہ تسخیر کائنات کے ان عزائم کو صحیح راستے پر ڈالے۔ انسانی روح کو جِلا دے، قلب کو ایمان کی ضوفشانیوں سے منور کرے۔ سیرت و کردار کو حسن اخلاق سے سنوارے اور ایک ایسا صحت مند معاشرہ تعمیر کرے جو اخوت، بھائی چارہ اور ہمدردیٔ بنی نوع انسان کے جذبہ سے سرشار ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن حکیم میں زمین کا ذکر ہے، نجوم و کواکب کا بیان ہے شمس و قمر کے بارہ میں تصریحات ہیں اور اختلافِ لیل و نہار کی تفصیلات ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں لیکن قرآن حکیم اس حیثیت سے ان کا تذکرہ نہیں کرتا کہ وہ کسی سائنسی حقیقت کو بیان کر رہا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ ان میں جو حکمت پنہاں ہے اس پر غور کریں۔ ان میں جو قانون اور قاعدہ کی کارفرمائیاں ہیں ان کو دیکھیں اور ان آیات اور واضح دلائل سے اس نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں کہ اس کارگاہِ حیات کو یونہی بلا مقصد پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ علیم و حکیم خدا نے اس کو اس عظیم مقصد کے تحت پیدا کیا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے اور اس کے ساتھ ربط و تعلق کے رشتوں کو استوار کرے۔ اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضروری ہے کہ آپ مندرجہ آیات کو ان کے صحیح سیاق میں دیکھیں۔

(۱) هو الذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوا فی مناکبها وکلوا من رزقه و الیه النشور۔ (ملک/۱۵)

"وہی ذات گرامی ہے جس نے تمھارے لیے زمین رام کر دی، سو اس کے رستوں میں گھومو، پھرو اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف دوبارہ اٹھ کھڑا ہونا ہے"۔

(۲) فالق الاصباح وجعل اللیل سکناً والشمس والقمر حسباناً ذالك تقدیر العزیز الحکیم۔ (انعام/۹۶)

"وہی تاریکی کے پردوں کو چاک کر کے صبح نکالنے والا ہے اور اس نے رات کو چین اور راحت کا ذریعہ ٹھہرایا اور آفتاب و ماہتاب کو ایک انداز اور قاعدہ کے تحت رکھا۔ یہ اسلوب اس عزیز و حکیم خدا کا اختیار کردہ ہے"۔

(۳) ان فی اختلاف اللیل والنهار وما خلق الله فی السمٰوٰت والارض لآیات لقوم یتقون۔ (یونس/۶)

"بلاشبہ رات اور دن ادل بدل کر آنے میں اور جو کچھ اس نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کیا ہے ان میں پاکبازوں کے لیے نشانیاں ہیں"۔ (باقی آئندہ)

مسلم ثقافت ہندوستان میں

از: مولانا عبدالمجید سالک

اس کتاب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے برِ عظیم پاک و ہند کو گزشتہ ایک ہزار سال کی مدت میں کن برکات سے آشنا کیا اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا۔ قیمت: ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com